غزالہ نگار اورکزئی
محبت قطب ستارہ

غزالہ نگار اورکزئی

محبت قطب ستارہ

میں پچھلے پانچ گھنٹوں سے بابا کا سیف کھولے بیٹھی ہوں۔ صالحہ ابھی ابھی میرے پاس کافی کا مگ رکھ کر گئی ہے۔ مجھے مصروف دیکھ کر حسرت سے بولی۔

"آپا! کتنا حوصلہ ہے تمہارا۔ باپ کی موت نے ہماری تو کمر توڑ ڈالی ہے۔"

حالانکہ بابا کئی دنوں سے بہت بیمار تھے۔ ہاسپٹل کے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھے اور ان کی نحیف اور کمزوری دیکھ کر ہمیں احساس ہونے لگا تھا کہ اب وہ زیادہ نہیں جئیں گے۔ پھر بھی باپ تو باپ ہوتا ہے ناں۔ سر کا سایہ۔ وہ اپنی زندگی گزار چکے تھے۔ ہم چاروں بیٹیوں کو اپنے گھروں میں آباد اور سکھی دیکھ چکے تھے۔ نہ صرف ڈھیروں نواسے نواسیاں بلکہ ان کے بچے بھی دیکھ چکے تھے۔

ہم سمجھتے تھے وہ بڑے خوش قسمت انسان تھے بڑے چین و سکون کی اور کامیاب زندگی گزار کر گئے۔ ہمیں انہوں نے اتنا پیار دیا تھا کہ ان کی موت ہمیں بھی ادھا مار گئی ہے۔

پر یہ تو آج ان کے کاغذات کی چھان بین میں پتا چلا ہے کہ بابا جیسے نظر آتے تھے ویسے تھے نہیں۔ اس پرسکون سمندر کی تہہ میں کیسے کیسے تلاطم خیز طوفان انگڑائیاں لیتے تھے۔ جنہیں بابا نے کبھی سطح پر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

اور میری سمجھ میں نہیں آتا بابا کہ آپ کی ان ذاتی ڈائریوں اور ان خطوط کا جنہیں ہوا بھی نہ چھو کر گزری ہوگی کیا کروں۔ تاکہ یہ راز کسی اور تک نہ پہنچے ورنہ کم از کم میری بہنیں یہ ہی سمجھیں گی ناں کہ آپ نے ہماری ماں کو دھوکا دیا۔ انہیں ہر سکھ دے کر بھی ان سے بے وفائی بھی کی۔ آپ کا دل ہمیشہ کسی اور شمع کا پروانہ بنا رہا۔

پر بابا! میں شاید زندگی میں آپ کو سب سے زیادہ بہتر سمجھتی تھی اور بعد از مرگ بھی۔

پہلے پہل مجھے بھی غصہ آیا تھا کہ آپ نے ہماری ماں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ آپ نے ان سے شادی تو کر لی لیکن آپ لیلیٰ آنٹی کو کبھی نہیں بھولے۔ پچاس، پچپن سال بعد بھی، مرتے دم تک آپ ایک اسی ہستی کی محبت میں سرشار رہے۔

لیکن پھر مجھے اپنا ذاتی المیہ یاد آنے لگا۔ اپنے ماضی کا وہ چہرا جسے ایک مطمئن اور کامیاب زندگی گزارنے کے باوجود میں نہیں بھول پائی۔

وقار حمید نے ماورائی خواب مجھے دیے اور شادی عذرا خان سے کر لی۔ پر کیا آج تیئس سال بعد بھی میں اس بے وفا کو بھول سکی؟

ہاں بابا۔ یہ محبت ایسا ہی گہرا زخم ہے جو کبھی نہیں بھرتا۔ اور گہرا اور پایاب ہوتا چلا جاتا ہے۔

جب میں وقار حمید جیسے انسان کو اس کے گھٹیاپن کے باوجود نہیں بھولی تو آپ اس عورت کو کیسے بھول جاتے جس نے آپ کی محبت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا اور آپ کی یاد سے ایسی وفا کی کہ آپ رات کے پچھلے پہر اٹھ اٹھ کر اس کے لیے رویا کرتے تھے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"عورت کا دوسرا نام ایثار رکھ دو۔ وفا کا دوسرا نام لیلیٰ احمد رکھ دو کہ اس جیسی دوسری روح پھر کبھی اس دنیا میں نہ آئے گی۔"

ہاں بابا۔ واقعی آپ کا اس روح سے سمبندھ ایسا تھا۔ نہ ہوتا تو لیلیٰ آنٹی جو زمانوں قبل، سات سمندر پار اجنبی زمینوں میں گم ہو گئی تھیں۔ اسی سہ پہر فون کرتیں جس دن آپ اس جہان سے گزرے تھے۔ اور آپ کی وفات کی خبر سن کر لیزا آنٹی کے ہاتھوں میں جان نہ دے دیتیں۔

کیا آپ کی روحوں نے اکٹھے آسمانوں کا سفر کیا ہوگا بابا۔ اور میں سوچتی ہوں کیا پایا ہوگا ان لوگوں نے جنہوں نے آپ کا خوبصورت دل اجاڑ کر رکھ دیا۔

لوگ یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ دو انسان اور میچیور سمجھے ہوئے انسان جب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی رفاقت چاہتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے کی تمام خامیاں، تمام خوبیاں قبول ہوتی ہیں۔ وہ اس ایثار اور قربانی کے جذبے کے تحت ایک بہتر خاندان اور زیادہ صحت مند معاشرے کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو

معاف کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی چھوٹی موٹی غلطیاں نظر انداز کر دیا کرتے ہیں، یہی قربانی بہتر زندگی کی اساس ہے۔ پر جہاں محبت نہ ہو وہاں ایسا کب ہوتا ہے۔ وہاں تو معمولی باتوں سے حادثے، جھگڑے اور المیے جنم لیتے ہیں۔ جہاں دوستی کی فضا نہ ہو وہاں عفو و درگزر کا کیا سوال۔

جب آپ ایک گھر میں رفیقوں کے بجائے رقیبوں کی طرح رہیں۔ ہر لمحہ آمادہ بہ پیکار۔ تو اس گھر کا بھلا کیا حشر ہوگا۔ اور مکینوں کا کیا بنے گا۔

میری ماں بھی اس دنیا میں نہیں لیکن بابا! میں اپنی پوری ایمانداری سے جانتی ہوں نہ وہ اچھی ماں تھیں نہ ہمدرد بیوی۔

نہ انہوں نے آپ کا دل جیتا نہ اس کے لیے کوئی کوشش کی بلکہ اپنے بیزار رویے سے اپنی اولاد کو ہمیشہ خود سے دور رکھا۔ آپ کے دکھ کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیے۔

انہوں نے خود کو، آپ کو اور شاید ربّ کریم کو بھی اس بات کے لیے کبھی معاف نہیں کیا کہ چار بیٹیاں ان ہی کا مقدر کیوں بنیں جبکہ میکے اور سسرال میں صرف لڑکے ہی تھے اور اپنی ان تمام بدقسمتیوں کا ذمے دار وہ براہِ راست آپ کو قرار دیتی تھیں۔

میں سوچتی ہوں بابا! آپ نے ہم چاروں کو سینے سے نہ لگایا ہوتا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہماری نگہداشت اور بیماری میں ساری ساری رات بیٹھ کر ہماری تیمارداری نہ کی ہوتی تو آج ہم کہاں ہوتیں۔

آپ نے چار بیٹیوں کا باپ بننے پر خود کو بدقسمت کبھی نہیں سمجھا۔ آپ تو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ آپ کی نجات ہمارے ذریعے ہوگی۔ ہم آپ کی آنکھوں کی روشنی آپ کے دل کی ٹھنڈک تھیں۔ آپ ہمیں دیکھ کر جیتے تھے خوش رہتے تھے۔

اس ناراضگی کی فضا میں جانے ہم کہاں سے آ نکلی تھیں یا شاید ہم ہی وہ کڑی در کڑی زنجیر تھیں جس نے آپ دونوں کو باندھے رکھا۔ ورنہ شاید کسی مرحلے پر آپ دونوں کے راستے الگ بھی ہو جاتے۔

آپ کہتے تھے اچھی عورت دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور میں اپنی بچیوں کو دنیا کی بہترین عورتیں بناؤں گا تاکہ وہ اگلی نسلوں کی اچھی پرورش کر سکیں۔"

آپ کو ہم چاروں سے شدید محبت تھی۔ آپ نے لیلیٰ آنٹی کو پوری صداقت سے چاہا تھا اور صرف امی کا معاندانہ اور منفی رویہ آپ کو راہ سے نہ ہٹا سکا نہ ہماری صنف سے متنفر کر سکا۔

آپ کی بیٹیوں نے آپ کی زندگی میں ہی آپ کے خواب پورے کر دیے تھے۔ اور جب آپ اپنے دامادوں سے بیٹیوں کی سسرال سے ان کی تعریف و توصیف سنتے تھے تو آپ کے پیارے چہرے پر کیسا سکون، کیسا نور پھیل جایا کرتا تھا۔ یہ اطمینان صرف اور صرف ایک باپ کی سچی اور اعلا تربیت کا صلہ تھا۔ اور وہ بھی ایک عورت ہی تھی جس کی بے پایاں محبت، لامتناہی خلوص اور مثالی وفا نے آپ کا کلیجہ ٹھنڈا رکھا تھا اور شاید اسی وجہ سے آپ نے اپنا پیار ہم پر اس طرح نچھاور کیا کہ لوگ ہم پر رشک کیا کرتے تھے۔ ایسے باپ کی خواہش کرتے تھے۔

خیال آتا ہے وہ کیسی شام ہوگی جب آپ لیلیٰ آنٹی سے ہمیشہ کے لیے بچھڑے ہوں گے۔

جب پھوپھو نے آپ کی شادی اپنی نند سے کرنے کا فیصلہ سنایا ہوگا۔

اور جب شیلا چاچی اپنی لاڈلی بہن کی ناکام آرزوؤں کا ماتم کر کے رہ گئی ہوں گی۔

جب آپ نے ہزار احتجاج کے باوجود کچھ نہ پایا ہوگا کہ دادی کے مرنے کے بعد پھوپھو ہی نے آپ کو پالا تھا اور ان احسانات کے بوجھ تلے آپ یوں دب گئے تھے کہ بہن اور بہنوئی کے سامنے اپنی پسند کے اظہار کے باوجود فرمانبرداری کا یہ طوق گلے میں ڈالنا پڑا۔

اور کسی کی زبانی ہم نے یہ کہانی آج تک نہ سنی تھی۔ لیکن آپ کی ڈائری کہتی ہے کہ شادی کی رات آپ کے لیے شامِ غریباں بن کے اتری تھی۔

آپ لیلیٰ احمد سے جو جدا کر دیے گئے تھے۔ اور کوئی قول و قرار نہ ہونے کے باوجود آپ کا سر اس ہستی کے سامنے ہمیشہ کے لیے جھک گیا جو آپ کا خواب تھی۔ لیلیٰ احمد کبھی آگے نہ بڑھی تھیں لیکن اب تو اور بھی پیچھے ہٹ گئی تھیں کہ انہیں معلوم تھا ان کی بہن اپنی تیز مزاج نند کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکیں گی اور پھر کیا وہ اپنی بہن کا رشتہ دیور کے لیے پیش کرتیں۔ وہ بہن جو لاکھوں میں ایک تھی۔ اور جس کے بے شمار لوگ طلب گار تھے۔ لیکن جس نے دل وہاں ہارا جہاں مقدر نہ تھا۔

لیلیٰ احمد کو یہ بھی معلوم تھا کہ کمال حسین اپنی بڑی بہن کو ماں کا درجہ دیتے تھے۔ وہ ان سے نہ کوئی جنگ جیت سکیں گے، نہ ان کا دل دکھا سکیں گے، بس خود قربان ہو جائیں گے۔

آپ دونوں یہ بھی جانتے تھے کہ یہ زبردستی کا بندھن کبھی کامیاب نہ ہو پائے گا۔ ایک "ادھورا پن"، ایک خلا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کے وجود کا حصہ بن جائے گا۔ آپ کبھی کھل کر دل سے مسکرا نہ سکیں گے۔

اس شکست کے بعد آپ کبھی تن کر سر اٹھا کر نہ چل سکیں گے۔ کہ اس ہار نے آپ جیسے خوددار لوگوں کو کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

آپ میں ایک دوسرے کا سامنا کرنے کا یارا نہ تھا۔ اور چونکہ آپ کی ہجرت ممکن نہ تھی بابا! اس لیے لیلیٰ آنٹی نے بیرونِ ملک جانے کا فیصلہ کر لیا۔

آپ کی شادی کے وقت وہ ایم بی بی ایس فائنل ایئر میں تھیں اور اس زمانے میں انگلیوں پر گنی جانے والی چند ایک خاتون ڈاکٹروں میں سے تھیں۔ قابلیت بھی تھی اس لیے ایم بی بی ایس کرتے ہی انہوں نے باپ سے اجازت لی اور انگلینڈ کا رختِ سفر باندھ لیا۔

اور جب لیلیٰ احمد اجنبی زمینوں کی طرف روانہ تھیں آپ کو علم تھا بابا۔ وہ کبھی پلٹ کر نہ آئیں گی۔ آپ نے ان کے چہرے پر ایک عزم اور اپنے کرچی کرچی خوابوں کا لہو دیکھ لیا تھا۔

شیلا چاچی رو رو کر آدھی موئی ہوئی جاتی تھیں۔ ان زمانوں میں کہاں کنواری لڑکیاں یوں تنہا نکلتی تھیں پر لیلیٰ آنٹی نے پورے خاندان کی مخالفت مول لی اور اپنا ارادہ نہیں بدلا۔

جس وقت لیلیٰ آنٹی کے جہاز نے کراچی کی بندرگاہ کو چھوڑا تھا آپ لکھتے ہیں آپ کی روح نے آپ کے بدن کو چھوڑ دیا تھا اور پھر جہاں جہاں لیلیٰ آنٹی گئیں آپ کی روح نے وہاں وہاں اپنی محبوبہ کا تعاقب کیا تھا۔ کئی سالوں بعد لیلیٰ آنٹی نے آپ کے اعتراف نامے کے جواب میں لکھا۔

کہ وہ آپ کی موجودگی قدم قدم پہ، زندگی کے ہر مرحلے پہ اکرائسس میں محسوس کرتی رہی تھیں۔ آپ کی محبت، آپ کی وفا ہمیشہ ان کے اردگرد منڈلاتی رہی تھی۔ جبھی تو ان کے زخمی دل اور ان کی داغدار روح کو قرار مل گیا تھا۔

وہ جانتی تھیں کہ انہوں نے آپ کو کھو کر بھی ہمیشہ کے لیے جیت لیا ہے۔ یہ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل والی بات نہ تھی۔ یہ چند دنوں بعد ایک دوسرے کو فراموش کر دینے والا واقعہ نہ تھا۔ یہ تو ابد تک کے لیے روح میں ایک گہرا اور محبوب زخم پالنے والا احادثہ تھا۔ جس تک کوئی نظر، کوئی سوچ کوئی دوا نہ پہنچ سکی۔ یہ ہمیشہ کے لیے جلتی رہنے والی مدھم آنچ تھی جس کی لو سدا کے لیے آپ کی آنکھوں میں بس گئی تھی۔

جب میں چھوٹی تھی تب بھی بابا کی آنکھیں مجھے بے حد اچھی لگا کرتی تھیں اور میں تب بھی اپنے بچکانہ انداز میں سوچا کرتی تھی۔ کہ میرے بابا کی خوبصورت آنکھوں میں پانی کیوں بھرا رہتا ہے۔

پھر جب میں بڑی ہوئی، اب بھی میں سوچتی۔ ایک جھیل سی بابا کی اداس آنکھوں میں کیوں ٹھہر گئی ہے۔ سالوں بعد جب وقار حمید، عذرا خان سے شادی کر کے امریکہ چلے گئے اور میرے اندر برسات کا موسم اتر آیا تو ایک دن آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر میں خود چونک اٹھی تھی۔

میں نے بار بار اپنی آنکھیں دیکھیں جو ہمیشہ سے بابا کی آنکھوں جیسی تھیں۔ پر آج پہلی بار کسی نے میرے

کتنے زمانے گزر گئے تھے۔ اس محبوب ہستی کو دیکھے ہوئے۔ حالانکہ انگلینڈ کوئی ایسا دور بھی نہ تھا۔ ہاں ان گنت گھریلو ذمے داریوں نے آکٹوپس کی طرح بری طرح سے انہیں جکڑے رکھا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ میں لیلیٰ آنٹی سے ملنے جاتی وہ خود مجھ سے ملنے چلی آئیں۔

شیلا چاچی نے انہیں میرے بارے میں خط لکھا تھا اور انہوں نے میری طرح دیر نہیں لگائی۔

خزاں کی اس زرد، ابر آلود دوپہر کو وہ مجھے لینے کالج کی ایک سائیڈ واک پر ملی تھیں اور کچھ پوچھے بغیر ہی انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"تم۔ تم کمال حسین کی بیٹی ہو ناں؟" انہوں نے کھوئی ہوئی آواز میں پوچھا تھا میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہاری آنکھیں بالکل کمال جیسی ہیں۔ میں نے تمہاری آنکھیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ تم ہی لیل النہار ہو۔"

"لیل النہار۔" مجھے سبھی ہمیشہ سے نیرا کہتے تھے۔ پہلی بار میرے ذہن میں خیال کوندا۔ میرا نام لیلیٰ آنٹی سے کتنا ملتا تھا۔ اب تو خود اپنا نام بھی میرے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔

"لیلیٰ آنٹی! آپ کتنی خوبصورت ہیں۔" میں نے مرعوب ہو کر بے اختیار ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

حقیقتاً وہ میری امی سے زیادہ خوبصورت نہ تھیں بس پرکشش تھیں۔ لیکن جب میں نے انہیں دیکھا تب بالوں میں بکھرتی چاندنی اور چہرے کی مستقل اداسی ان کی مقناطیسی شخصیت کا مستقل حصہ بن چکی تھی۔

"شیلا چاچی سچ کہتی تھیں کہ ان کی بہن دنیا کی سب سے حسین لڑکی تھی۔" میں نے پھر کہا۔

لیلیٰ آنٹی مسکرا دیں۔ "ہم دو ہی تو بہنیں تھیں اور شیلا آپا مجھ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی تھیں کہ انہیں مجھ میں کوئی خامی نظر نہ آتی تھی۔"

شیلا چاچی سے بابا اور پھر کہاں کہاں خاندان کی باتیں نہ ہوئیں۔

لیلیٰ آنٹی دو دن میرے پاس ٹھہریں اور بہت جلد ہم اتنے قریب آ گئے کہ جب وہ جا رہی تھیں تو ایک عجیب سی اداسی مجھے اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یوں جیسے میرے اندر سے کوئی شے نکل کر لیلیٰ آنٹی کے ساتھ رواں تھی۔ یوں جیسے میں ایک بار پھر سے جدا ہو رہی تھی۔ حالانکہ تب تو عہد پارینہ کی اس ناقابل شکست محبت کا مجھے سان و گمان بھی نہ تھا۔ میں نے بابا کو لکھا۔

"میں نے آج تک لیلیٰ آنٹی جیسی نفیس اور گریس فل خاتون نہیں دیکھی۔ لگتا ہے میں پہلی نظر میں ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہوں۔"

خدا جانے میرے یہ الفاظ پڑھ کر بابا کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ شاید بہت ہی اچھوتی خوشی ہوئی کہ میں نے، ان کے وجود کے ایک حصے نے نہ صرف ان کی محبت کو انجانے میں پہچان لیا تھا، تسلیم کر لیا تھا بلکہ اس سے وہی گہرا اور روحانی رشتہ استوار پایا تھا جو ان کے اور بابا کے درمیان تھا۔ گویا میں بھی آہستہ سے دو افراد کے درمیان اس خاموش سلسلے میں شامل ہو گئی تھی۔

صالحہ نے مجھے لکھا، شیلا چاچی میرا خط پڑھ کر بہت روئی تھیں۔ وجہ تو صالحہ کو معلوم نہ تھی لیکن روتے روتے چاچی پہ نقاہت طاری ہو گئی تھی۔

عورت کا دل مرد سے زیادہ کمزور ہوتا ہے ناں۔ میں نے جو بات ہنسی مذاق میں بابا کو لکھی تھی سیدھی جا کر شیلا چاچی کے دل پہ جا لگی تھی۔ اور امی کی شکنوں میں غالباً مزید اضافہ ہو گیا تھا کہ لیلیٰ آنٹی انہیں کبھی بھی پسند نہ تھیں۔ حالانکہ انہیں کوئی اندازہ نہ تھا کہ لیلیٰ آنٹی اور ان کے شوہر میں کوئی تعلق بھی تھا۔

پھر انگلینڈ میں میری پہلی کرسمس آئی۔ چھٹیاں تھیں میں نے پورا لندن اور گرد و نواح کا ہر قابل دید مقام چھان مارا اور پھر بھی چھٹیاں باقی تھیں اور کرنے کو کچھ نہ تھا۔

اور جب کرنے کو کچھ نہ ہو تو دل پھر اپنے زخم کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے۔ جس دکھ کو مصروفیات کے پردوں میں چھپا دیا تھا وہ پھر سے اپنی نقاب کشائی کرنے لگتا

اندر سے کہا تھا کہ بابا کی آنکھوں میں بسنے والی جھیل میری آنکھوں تک پھیل گئی تھی۔

کیوں ویران جزیرے بن گئے تھے ہمارے اندر؟ کیوں نمکین جھیلیں ابھر آئی تھیں ہمارے چہروں پر؟ میرے اندر تو کانٹے اگنے لگے تھے۔ کیکٹس کے پودوں جیسی زہریلی شاخیں اتر گئی تھیں میری رگ رگ میں۔

پہلی بار مجھے شک ہوا تھا بابا۔ کہ آپ کے اندر بھی کوئی جنگل پلتا رہا ہے۔ دکھ کا گھنا اور ہرا بھرا جنگل۔

پر پھر میں نے سوچا آپ چار بیٹیوں کے مستقبل کے لیے فکر مند ہوں گے۔ آپ میرے لیے پریشان ہوں گے کیونکہ میں نے آپ سے وقار حمید کے بارے میں کچھ بھی نہ چھپایا تھا بلکہ ہم دونوں تو بے حد پرامید اس کی آمد کے منتظر تھے۔

جس شام میں نے آپ کو وقار کی شادی کا بتایا تھا۔ اس دن پہلی بار ان پیاری آنکھوں کی جھیلوں میں جوار بھاٹا اٹھتے دیکھا تھا اور تڑپ کر آپ کے آنسو پونچھے تھے۔ بیس تیس سال پہلے اس شام آپ نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا اور جو تب میری سمجھ میں نہ آیا تھا، اب مجھے یاد آ رہا ہے۔ اب سمجھ میں آ رہا ہے۔

آپ کا وہ بھاری، غم ناک لہجہ، آپ کی آواز۔

"بیٹا! معاف کر دو وقار کو۔ خدا جانے اس کی کون سی مجبوریاں ہوں گی۔ لوگ جان بوجھ کر دوسروں کو دکھ نہیں دیتے چندا! بے وفائی کا عمل بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ یہ تو خود دکھ اپنے ہاتھوں تقسیم کرنے والی بات ہے۔"

"مرد اور مجبوری؟" میں نے حیران ہو کر بابا سے پوچھا تھا۔ "مرد کی بھی بھلا کوئی مجبوری ہو سکتی ہے؟"

اور یہ بے وفائی کا داغ میں نے اتنے سال سینے میں چھپائے رکھا۔ یہ کدورت پل پل کر جوان ہوتی رہی اور اب آپ مرد ہیں بابا۔ تو مجھے معلوم ہوا ہے مرد واقعی مجبور ہو سکتا ہے۔ قابل رحم ہو سکتا ہے اور مرد ہی کی کیا بات، انسان ازل سے مجبوریوں کی آہنی زنجیروں میں گرفتار ہے۔ پرومیتھیس کی طرح۔

خدا جانے وقار حمید کی کون سی مجبوریاں تھیں۔ مجھے آج تک، اس کے مرنے کے پانچ سال بعد بھی اس بات کا علم نہ ہو سکا۔ پر آج میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اتنے سال پرانی خلش کو۔ اس کدورت کو مٹا ڈالا ہے اور اپنے آپ کو کس قدر ہلکا محسوس کر رہی ہوں۔

اگر میرے بابا جیسے مضبوط اور جواں مرد مجبور کیے جا سکتے ہیں تو وقار تو ان جیسا سربفلک کبھی بھی نہ تھا۔

اس شام بابا کی آنکھوں میں صرف میرے لیے کا سوگ نہ تھا۔ وہ تو اپنی پوری صنف کے سرکشیدہ جوانوں کا ماتم تھا جو ان کے چہرے سے عیاں تھا۔

ہر سینے میں ایک نہ ایک دکھ کا یا محبت کا مزار ضرور ہوتا ہے جیسے میرے سینے میں تھا۔ پر بابا، آپ کے سینے میں تو پورا قبرستان ہو گا جس میں نصف صدی سے زائد خوشیوں کے مزار ہوں گے۔

وہ خوشیاں، وہ مسرتیں جو آپ کو مل سکتی تھیں پر آپ کے دامن میں انگارے ڈال دیے گئے۔ جو آپ کے چہرے پر گلشن کھلا سکتی تھیں۔ پر دوسروں کی رضا اس میں شامل نہ تھی۔

پھر بھی آپ نے کسی کی حق تلفی کیے بغیر، کسی کا جائز حق مارے بغیر، کسی سے ناانصافی کیے بنا اپنی محبت کو ہمیشہ یاد رکھا۔ حالانکہ آخری بار آپ نے وہ چہرا کم از کم پینتالیس سال پہلے دیکھا تھا۔ جب میں بار ایٹ لاء کرنے انگلینڈ جا رہی تھی۔ بابا اور شیلا چاچی نے مجھے لیلیٰ آنٹی کا ایڈریس دیا تھا اور کیسی حسرت سے تاکید کی تھی کہ ان سے جا کر ضرور ملوں۔

مجھے خود بھی بے حد اشتیاق تھا کہ جس ان دیکھی ہستی کا ذکر ہمیشہ سنا تھا۔ جس کی تصویریں شیلا چاچی کے البم میں سجی تھیں اس سے ضرور ملوں۔ پر ہوا یوں کہ انگلینڈ پہنچ کر میں اتنی معروف ہوئی کہ لیلیٰ آنٹی سے فوراً نہ مل سکی۔

یوں بھی وہ انگلینڈ کے ایک دور افتادہ شہر کے اسپتال میں کام کرتی تھیں۔ جہاں جانے آنے کے لیے کم از کم تین چار دن درکار تھے۔

ان دنوں بابا سے میری فون پر جب بھی بات ہوتی میں نے پہلی بار ان کے لہجے میں ناراضگی کا آہنگ سنا۔ بابا شاید اتنے سالوں بعد میری آنکھوں سے لیلیٰ آنٹی کو دیکھنا چاہتے تھے۔

ہے۔ پھر سے زخم کریدا جانے لگتا ہے۔

تنہائی پا کر میں پھر ڈپریشن کا شکار ہونے لگی تھی۔ بے پناہ سردی تھی۔ چنانچہ بستر میں دبک کر سوچنے کے سوا کیا تھا؟

شاید کسی خفیہ حس نے لیلیٰ آنٹی کو بتایا ہوگا کہ مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔

ڈپریشن کی پہلی شام ہی ان کا فون آ گیا۔

"کیا کر رہی ہو نیرا خان؟" وہی پیار بھری آواز تھی۔

"بور ہو رہی ہوں جی بھر کے۔" میں نے شیشوں میں سے تسکستان کی قدیم عمارت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور کتنی چھٹیاں باقی ہیں؟" آنٹی نے پوچھا۔

"ابھی تو ایک ہفتہ اور رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تو تم وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو نکمی لڑکی! بیگ اٹھاؤ اور فوراً آ جاؤ میرے پاس۔" آنٹی بولیں۔

انگلینڈ کا وہ سرا دیکھنے کا پہلا موقع تھا میں نے وہ دعوت فوراً قبول کر لی اور اگلی ہی شام میں آنٹی کے گرم گرم نفاست سے آراستہ لاؤنج میں بیٹھی کافی پی رہی تھی۔

آنٹی کس قدر خوش تھیں۔ مجھے ان کے چہرے اور ان کی بوکھلاہٹ سے اندازہ ہو رہا تھا اور اس خوشی کی وجہ شاید یہ بھی کہ میری صورت بابا کے وجود کا ایک حصہ ان کی چھت تلے موجود تھا۔ اور شاید یہ بھی کہ بہت عرصے بعد کوئی اپنا ان کا مہمان ہوا تھا۔

یوں تو جب تک ان کے ابا زندہ تھے ہر سال گرمیوں میں تین چار ماہ اپنی پیاری بیٹی کے پاس انگلینڈ جایا کرتے تھے۔ لیکن اب تو ان کی وفات کو بھی زمانے گزر چکے تھے۔

شیلا چاچی اور اکبر چاچا ہر پانچ چھ سال بعد ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ خاندان کا کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا فرد گاہے بگاہے انگلینڈ جا ہی نکلتا تھا۔ لیکن میری جیسی اہمیت ان کے لیے شاید کسی کی نہ ہوگی۔

آنٹی نے وہ گھر انگلینڈ آنے کے تین سال بعد خریدا تھا۔ بلکہ ان کے والد نے ان کی ایک سالگرہ پر ان کو تحفے میں دیا تھا۔ اور وہ گھر ان کی شخصیت ہی کی طرح نفیس، پرسکون اور آرام دہ تھا۔ سچ کہتے ہیں گھر اپنے مکینوں کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں۔

آنٹی نے ان تمام سالوں میں بھی اپنے کلچر سے اپنا تعلق نہ توڑا تھا۔ ان کا رکھ رکھاؤ، ادب آداب اب بھی بڑی حد تک مشرقی تھے۔ حالانکہ ان کا تمام بچپن بھی ان کے والد کے کاروبار کی وجہ سے افریقہ میں گزرا تھا۔ ان کی سوچ مشرقی تھی اور ان کی وفا مشرق کے سر کا تاج تھی۔

وہاں بھی کون تھا جو ان کا پرستار نہ تھا۔ مجھے ان کے قریب ترین اور بے حد پیارے دوستوں سے ملنے کا بھی موقع ملا۔

ڈاکٹر شرلور، الیگزینڈر شرلور ایم ڈی تھے اور ہاسپٹل کے سب سے قابل اور سینئر سرجن۔ بے حد پرکشش اور پرمزاح شخصیت کے مالک۔ پچاس سال کا ہونے کے باوجود ان کا دل نوجوانوں سے زیادہ جوان تھا۔ ان کی شخصیت زیادہ ہنگامہ خیز تھی۔

"نیرا، میں دو ناکام شادیوں سے گزر چکا ہوں اور تمہیں پتا ہے میری شادیاں ناکام کیوں ہوئیں؟" انہوں نے سوڈا اور لیمن کی چسکیاں لیتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہا۔

"میں یقیناً جاننا چاہوں گی کہ آپ جیسے دلچسپ آدمی اس محاذ پر ناکام کیسے ہوئے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں پہلی نظر میں لیلیٰ کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا اور یہ تب کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔" انہوں نے چھت پہ نظریں ٹکاتے ہوئے خلافِ توقع اداسی سے کہا۔

"نیرا بیٹے! اس شخص کی باتوں میں نہ آنا۔ بڈھا ہو کر سٹھیا گیا ہے۔" آنٹی برجستہ بولیں۔

ڈاکٹر شرلور ہنسنے لگے۔ وہ دونوں اتنے پرانے دوست تھے کہ ایک دوسرے کے کہنے کا برا نہیں مانتے تھے۔

آنٹی نے انہیں 'جنرل' کہنا شروع کیا تو وہ آنٹی کو فیلڈ مارشل کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ دل کا میدان جو جیت لیا تھا آنٹی نے پہلے ہی ہلے میں۔

"میری پہلی بیوی نے مجھ پہ یہ الزام لگایا تھا کہ میں بے حد سرد مزاج آدمی ہوں۔" ڈاکٹر شرلور پھر سنجیدہ ہو گئے۔

"آپ جیسے جولی گڈ فیلو کیسے سرد مزاج ہو گئے؟" میں حیران ہونے لگی۔

"میں اسے وہ محبت نہ دے سکا تھا جس کی وہ طلب گار اور حقدار تھی۔" انہوں نے بڑی دیانت داری سے اعتراف کیا۔ "اور میری دوسری بیگم فرماتی تھیں کہ میں انتہائی گرم مزاج آدمی ہوں یعنی خواتین کسی حال میں خوش نہیں ہوتیں ناں۔"

دوسری بیگم صاحبہ مجھے قصائی کہا کرتی تھیں۔

صاحب مسکرانے لگے۔

"اوہ مجھے یہ سب سن کر بڑا افسوس ہوا ڈاکٹر!" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہے نیرا ڈیر! اس لیے کہ مجھے شادیاں کرنی ہی نہیں چاہیے تھیں۔ غلطیاں میری اپنی تھیں چنانچہ نتائج بھی مجھ ہی کو بھگتنے تھے!" ڈاکٹر صاحب بولے۔

"کیا آپ واقعی لیلیٰ آنٹی کے بارے میں سنجیدہ تھے؟" میں نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے انہیں چھیڑا۔

"سنجیدہ تھے۔ کیا مطلب؟" ڈاکٹر شرلور چیں بجبیں ہو کر بولے۔ "میں کل بھی اس سنگدل حسینہ سے محبت کرتا تھا اور اب جب اس کا سر سفید ہونے لگا ہے، تب بھی اس دیوانگی میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔"

"میں تم سے کہہ رہی ہوں نیرا ڈارلنگ۔ الیگزینڈر کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ تو چوتر سوں میں بھی فلرٹ کرنے کا عادی تھا۔" دور کاؤچ پہ بیٹھی آنٹی لیلیٰ نے مجھے تنبیہ کی تھی۔

"تم خود دیکھو نیرا اور سوچو کیا یہ خاتون چاہے جانے کے قابل نہ تھی؟" ڈاکٹر صاحب آہستہ سے سنجیدگی سے بولے۔ میں نے سر گھما کر آنٹی کی طرف دیکھا۔

سفید فرنچ شیفون کی ساڑھی میں آسمانی گرم شال لپیٹے، گلے میں سفید موتیوں کی ہلکی سی لڑی اور کانوں میں ملتے جلتے ٹاپس پہنے آنٹی لیلیٰ شہزادیوں کی سی شان سے کاؤچ پر جلوہ افروز تھیں۔ ان کے لمبے سیاہ بال جن میں اب چاندی پھیل رہی تھی جوڑے کی شکل میں سمٹے ہوئے تھے۔

اور ان کے گندمی چہرے کی رنگت اب بھی دمک رہی تھی۔ خوبصورت سیاہ آنکھیں جن میں عجیب سی سوگواری تھی اور لبوں پر کھیلتی سدا بہار مسکراہٹ جس نے ان کی شخصیت کی مقناطیسیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ ان کا میدانوں میں بہتے دریاؤں جیسا دھیما اور ٹھہرا ہوا بات کرنے کا انداز اور ہر انسان کے لیے بے لوث خلوص ــــــ بے حد پیار۔

بلاشبہ وہ نہ صرف چاہے جانے کے قابل تھیں بلکہ ان کی تو پوجا کرنے کو جی چاہتا تھا۔

ان کی شخصیت کا وہ طلسم، وہ حسن آج میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ اتنے سال میں یہی سمجھتی رہی کہ آنٹی شاید تھیں ہی ایسی شروع سے۔

پر آج، یہ سارے کاغذات چھانتے، بابا کے دل کا ایک ایک زخم پڑھتے سمجھ میں آ رہا ہے کہ لیلیٰ آنٹی نے کس شدت سے بابا کی پرستش کی ہوگی اور ابا کو ہمیشہ کے لیے کھو دینا ان کے لیے کتنا حادثاتی، کتنا قیامت خیز اور کیسا تباہ کن ہوگا۔

لیکن وہ مثبت سوچ رکھنے والی خاتون تھیں اور اس تباہی، اس قیامت سے ایک نئی زندگی نے جنم لیا تھا۔ ایک نئی سوچ کا ظہور ہوا تھا۔

آنٹی کو بابا کے بیکراں پیار پر کبھی رتی برابر شک بھی نہ ہوا تھا اور اس محبت نے آنٹی کو وہ اعتماد دیا تھا کہ ان کے اندر از خود پہاڑوں کی سی تمکنت ـــ وقار اور عجیب سا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔

بابا آنٹی کے لیے اور آنٹی بابا کے لیے قربانی دینے والوں اور خدا کی مرضی پہ راضی بہ رضا رہنے والوں کی علامت بن گئے تھے۔

آنٹی لیلیٰ نے خود کو میڈیکل سائنس میں تحقیق کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ جذباتیت میں نہیں کیا تھا۔ یہ تو بڑا سوچ سمجھ کے کیا جانے والا پختہ عزم تھا۔

اور جب ایک دفعہ ذہن کے تمام گنجلک، الجھے ہوئے راستے صاف ہو جائیں تو روح کے اندر کوئی تناؤ، کوئی شکن باقی نہیں رہتی بلکہ چہرے پر ایک لاہوتی روشنی اتر آتی ہے۔

آنٹی کی پشت پر ہمیشہ ایک نادیدہ، محبت بھرا

ہاتھ رہا اور دل کی گلیوں میں کبھی اندھیرے نہیں اُترے کیونکہ میرے بابا کا چہرا، میرے بابا کا نام چاند بن کر چمکتا رہا۔ ہمیشہ اپنی ٹھنڈی اور پُرسکون روشنی پھیلاتا رہا۔

آنٹی کے لیے یہ گھاٹے کا سودا کبھی نہ تھا۔ جبھی تو انہوں نے ہر انسان سے اور انسانیت سے بے لوث محبت کا راستہ اپنایا تھا۔

تو کردار کا عکس چہرے پر نمایاں کیوں نہ ہوتا۔ اس چہرے کی سکون بخش چاندنی نہ میں کبھی بھولی ہوں نہ بھول پاؤں گی۔

"سنو نیرا! کیا ایسا نہیں لگتا جیسے وہ کوئی بے حد قدیم اور پُراسرار شہزادی ہو جو تاریخ کے گم گشتہ اوراق سے نکل کر بھٹکتی ہوئی ہماری دنیا تک آ پہنچی ہو!"

میں نے ڈاکٹر شیرلور کی طرف دیکھا۔ وہاں عقیدت تھی، سنجیدگی تھی اور یقین تھا۔

"اس نے ہماری بے رنگ دنیا کو نور دیا، خوشبو دی، رنگ دیے لیکن المیہ یہ رہا نیرا پیاری! کہ ہم اسے کچھ نہ دے پائے۔ اس صدیوں پرانی روح کا ملن اس دنیا کے کسی انسان سے نہیں ہو سکتا ناں۔" وہ کہہ رہے تھے اور میں ان کا منہ تک رہی تھی۔

"دیکھو نیرا! اس کے انداز کیسے ماورائی ہیں۔ وہ بات کیسے کرتی ہے۔ میں جس سحر میں کئی سال پہلے گرفتار ہوا تھا۔ آج تک کوشش کے باوجود اس سے نکل نہیں پایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنا معیار اس خاتون کو دیکھ کر قائم کیا تھا۔ اور کوئی دوسری عورت پھر میرے قائم کردہ معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔" ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر جو کچھ تھا، سچائی تھی۔

"الیگزانڈر۔ تم پتا نہیں اس بچی کے ذہن میں کیا کیا ٹھونس رہے ہو۔ میں اب چلوں۔ یاد رہے کل کا ڈنر میرے ہاں ہے۔" آنٹی اُٹھتے ہوئے بولیں۔

واپسی میں بڑی ہمت کر کے میں نے آنٹی سے پوچھ ہی لیا۔

"آنٹی! ڈاکٹر شیرلور بہت پیارے انسان ہیں۔ آپ نے ان سے شادی کیوں نہ کی؟ انگلینڈ میں تو مختلف مذاہب، مختلف قومیتوں اور مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں شادیاں ہوتی ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

آنٹی نے ڈرائیو کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور اُداسی سے مسکرا کر بولیں۔

"میں اس کے جذبوں کو پہچانتی ہوں چندا لیکن الیگزانڈر میرے ساتھ کا نہیں تھا۔"

"تو کیا آپ بھی نصف بہتر کے فلسفے پر یقین رکھتی ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! کیا اس فلسفے میں سچائی نہیں۔ دنیا میں دو ہی انسان ایک دوسرے کے لیے تخلیق ہوتے ہیں اگر وہ ایک دوسرے کو نہ پا سکیں تو بڑا المیہ ہے۔ میں نے بھی سوچا تھا۔ شادی کروں گی تو اپنے اس ساتھی سے ورنہ کسی اور آدمی سے منافقت نہیں کروں گی۔" آنٹی گیئر بدلتے ہوئے بولیں۔

"تو کیا آپ کو اپنا ساتھی نہیں ملا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ملا تھا۔ یہ تمہاری پیدائش سے بھی بہت پہلے کا بڑا پرانا قصہ ہے بیٹا۔ لیکن پھر حالات اور واقعات ایسے ہوئے ہمیں چپ چاپ اجنبی بن کر ایک دوسرے کے پاس سے گزر جانا پڑا۔"

آنٹی نے کار اپنے پورچ میں روک دی۔

"مجھے یقین ہے آنٹی۔ آپ آج بھی ہاں کر دیں تو ڈاکٹر شیرلور سر کے بل آپ سے شادی کرنے آئیں گے۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"اب۔ اب کیا سوال شادی کا چندا! اب تو ہر طرف موسم سرما پھیل چکا ہے میری زندگی میں میرے بالوں میں برف ہی برف ہے۔" آنٹی نے ہر طرف پھیلی برف پہ نگاہ ڈال کر ٹھنڈی سانس لی اور دروازہ کھولنے لگیں۔

اگلی شام نیو ایئر ایو تھی۔ آنٹی نے اپنے دوستوں کو ڈنر پہ مدعو کیا تھا۔

کھانا پکانا انہوں نے جانے کب چپکے چپکے کر لیا

تھا۔ میں سو کر جاگی تو وہ لاؤنج کی صفائی اور آرائش کر رہی تھیں۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

شام ہوتے ہوتے سب سے پہلے انکل ٹموتھی ایک بہت خوبصورت کیک لیے آ موجود ہوئے جو انہوں نے بطور خاص اس موقع کے لیے بیک کیے تھے۔

پھر ڈاکٹر شیرلور اور مسز گورڈن آئے۔ ان کے بعد ڈاکٹر لیزا پالم اور سب سے آخر میں ڈاکٹر ایملی ہارٹ سیدھی ہاسپٹل سے آئیں۔

وہ ایک یادگار شب تھی۔ ڈنر کے بعد آنٹی روزا نے پیانو بجانا شروع کیا اور باقی سب مل کر گانے لگے۔ انکل ٹموتھی نے باری باری ساری خواتین کے ساتھ رقص کیا۔

بارہ کا گجر بجتے ہی برف باری شروع ہو گئی اور ساری رات بغیر رُکے یہ سلسلہ جاری رہا۔

صبح سویرے جب نئی سحر کا دیدار کرنے اور رخصت ہونے مہمان باہر نکلے تو سب کو یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی کہ باہر کھڑی گاڑیاں منوں برف تلے اوجھل ہو چکی تھیں۔ چنانچہ نئے سال کا پہلا دن یوں گزرا کہ انکل ٹموتھی اور ڈاکٹر شیرلور بیلچے لیے برف اتارتے رہے اور خواتین وقفوں سے گرم کافی، کیک اور سینڈوچز سے ان کی تواضع کرتی رہیں۔

سہ پہر کے قریب بالآخر جب منوں گرم پانی ڈالنے کے بعد گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں تو سب کا تھکن اور ٹھنڈ سے بُرا حال تھا۔

دوسرے دن میری واپسی تھی اور مجھے توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر شیرلور بھی مجھے رخصت کرنے آئیں گے۔ لیکن خلافِ امید وہ اسٹیشن پر موجود تھے۔

"تم نے اپنی آنٹی سے میری سفارش کی ہے؟" انہوں نے میرے ساتھ چلتے چلتے آہستہ سے سرگوشی کی۔

"ارے جس بت کو آپ اتنے سالوں میں نہ منا سکے میں اس کو چند دن میں کیا منا لیتی۔" میں نے افسوس سے کہا۔

ڈاکٹر شیرلور نے خوشدلی سے قہقہہ لگایا۔ "اس کے باوجود نیرا! ڈارلنگ میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔" ان کا لہجہ بڑا پُرعزم تھا۔ "مجھے امید ہے تم پھر آؤ گی۔ تم سے مل کر اور باتیں کر کے بہت لطف آیا۔ تم لیلیٰ کی عزیز ہو اور میری ہمدرد۔" ڈاکٹر صاحب گرم جوشی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔

اب خیال آتا ہے جس طرح بابا کے تعلق سے میں لیلیٰ آنٹی کو بے حد پیاری تھی۔ اسی طرح سے آنٹی لیلیٰ کے تعلق سے شیرلور کو محبوب رہی ہوں گی۔ میں ان دونوں کے لیے ان کی محبوب ترین ہستیوں کا معتبر حوالہ معتبر حصہ تھی۔

اور میں نے لیلیٰ آنٹی کو پیار کرتے ہوئے ان سے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گی۔ ساری چھٹیاں ان کے پاس گزاروں گی۔ یہ چھٹیاں جن کا آغاز تنہائی اور اکلاپے کے جان لیوا احساس سے ہوا تھا۔ میرے دامن میں نئی دوستیاں اور نئی محبتیں ڈال کر اختتام پذیر ہوئی تھیں۔ ایسا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ اور اب جب میں لوٹی تھی تو نہ صرف تازہ دم تھی بلکہ اپنے اندر ایک نئی صحت بخش توانائی محسوس کر رہی تھی۔

انگلستان اب اجنبی نہیں رہا تھا۔

میری پڑھائی کے وہ سال خوبصورت یادوں سے بھرپور ہیں۔ آنٹی لیلیٰ نے مجھے وہ محبتیں، وہ پیار دیا تھا جو اپنی سگی ماں سے نہ مل سکا تھا اور جو وہ خود کسی اور پہ نچھاور نہ کر سکی تھیں۔

ڈاکٹر شیرلور میرے لیے بابا کے بچھڑے وجود کا عکس بن گئے تھے۔

آنٹی کے باقی دوستوں کو بھی میرا دوست بننے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

بے تحاشا موٹی مسز گورڈن آنٹی روزا جن کے والد ہسپانوی، ماں روسی اور خاوند انگریز تھے۔ مجھے سب دوستوں سے زیادہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے محبوب شوہر کی وفات کا صدمہ چاکلیٹس اور کوکیز کی نذر کر دیا تھا۔ وہ آنٹی لیلیٰ کے پاس ایک قریب المرگ مریضہ کی حیثیت سے لائی گئی تھیں اور آنٹی لیلیٰ، آنٹی لیزا کی توجہ اور محبت نے انہیں نئی زندگی دی تھی۔

میرے لیے رنگ برنگے کیک اور مٹھائیاں بنا کر پارسل کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شاید اس طرح ان کے اس دکھ کا ازالہ بھی ہو جاتا تھا جو ان کی اپنی ناہنجار

اولادوں نے انہیں دیا تھا۔

بچے بڑے ہو کر اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ بیٹی ایک امیر امریکی سے شادی کر کے امریکہ جا چکی تھی۔ اور چاروں بیٹے خدا جانے دُنیا کے کس کونے میں تھے۔ نہ انہیں باپ کے مرنے کا پتا چلا نہ دُکھی ماں کی خبر لی اور بے چاری آنٹی روزا مینٹل پیس پہ رکھی ان کے بچپن کی تصویریں دیکھ دیکھ کر آنسو بہایا کرتی تھیں۔

مجھے یاد ہے۔ میں نے جب بھی انہیں کوئی چھوٹا موٹا تحفہ دیا انہوں نے اسے جان سے عزیز رکھا اور الٹا اپنی احسان مندی سے مجھے شرمندہ کر کے رکھ دیا۔

آنٹی ایملی مطلقہ تھیں۔ ان کی اپنے شوہر سے چار دن بھی نہ بنی تھی۔ اور اس کی وجہ یقیناً ان کی اپنی شخصیت کا مردانہ پن اور جارحانہ انداز تھا۔

میں اکثر ان سے کہتی کہ خدا نے انہیں مرد بناتے بناتے جانے کیسے عورت بنا دیا تھا۔ اور اس کے جواب میں ہمیشہ ایک بلند بانگ قہقہہ لگتا۔ آنٹی ایملی کے نزدیک یہ ایک مزے دار حقیقت تھی۔

آنٹی لیزا جرمن تھیں۔ ان دنوں جنگ عظیم دوئم کے خاتمے کو بمشکل دو دہائیاں ہی گزری تھیں اور اس کے اثرات ابھی خاصے ذہنوں پر باقی تھے۔ لوگ آنٹی لیزا سے دبتے تھے اور ان سے کنارا کیا کرتے تھے۔ لیکن ان سا ماہر نوروسرجن پوری کاؤنٹی میں کوئی نہ تھا۔

وہ بڑی حد تک آنٹی لیلیٰ کا دوسرا عکس تھیں کیونکہ اپنے پیشے سے انہیں دیوانگی کی حد تک عشق تھا۔

شادی ان کے نزدیک ایک فضول بات تھی جس کی ان کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ انہوں نے اچھے رشتے اور اچھے اچھے لوگوں کو ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔

آنٹی لیزا، جواب بھی بہت سے لوگوں کے لیے فراؤ لیزا تھیں، کا پورا خاندان برلن پر بمباری کے دوران مارا گیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ انگلینڈ چلی آئی تھیں۔

انکل ٹموتھی حقیقی معنوں میں بے حد خوش مزاج بڈھے تھے۔ میں انہیں چچا چھکن کہنے لگی تھی اور وہ اس ٹائٹل کی رام کہانی سننے کے بعد اپنے اس نام پر بڑا فخر کرنے لگے تھے۔

انہوں نے شادی کیوں نہیں کی، کچھ لوگ کہتے سمجھتے کہ انہوں نے ضعیف ماں اور معذور بڑی بہن کے لیے یہ قربانی دی تھی۔ اور اب دونوں خواتین اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ آپ سمجھتے تھے کہ شادی کی عمر بھی گزر چکی۔

حالانکہ مغرب میں خصوصیت سے عمر اور شادی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپ بڑھاپے بیاہ کر بھی شادی کر لیں تو لوگ زیادہ حیران نہیں ہوتے۔ (اسی لیے تو ڈاکٹر شرلوز، آنٹی لیلیٰ سے مایوس نہیں تھے)

ایک اور نظریہ انکل ٹموتھی کے بارے میں یہ تھا کہ ان کے بچپن کی سویٹ ہارٹ نے ان سے بے وفائی کر کے کسی امیر اٹالین سے شادی کر لی تھی اور انکل ٹم آج تک اسی کج ادا کا نام جپتے رہے تھے۔

بہرحال کچھ بھی ہو۔ انکل ٹم سارے شہر کا محبوب ترین کردار تھے۔ ہر ایک کے دُکھ درد میں شریک ہر ایک کی خوشیوں میں سب سے آگے۔ ہر کار خیر میں پہلی صف میں۔

جسے بھی اپنے غموں پہ آنسو بہانے کے لیے کسی ہمدرد شانے کی ضرورت ہوتی، وہ انکل ٹم کو اپنی پناہ گاہ سمجھتا کیونکہ انکل ٹم رونے والے سے زیادہ اور دھواں دھار رویا کرتے۔

جس کسی کو زندگی کے اندھے مسائل میں کوئی راہ سجھائی نہ دیتی۔ وہ انکل ٹم سے روشنی مانگنے آتا۔

غرض وہ بے سہاروں، بیواؤں، یتیموں، بے روزگاروں، بیکاروں، تنہا لوگوں، مریضوں اور لاچاروں یہاں تک کہ چوروں اور ڈاکوؤں کے بھی محبوب انکل تھے۔

سنتے تھے کہ ان کے چھوٹے سے گھر میں تالا لگانے کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ انکل ٹم کا فلسفہ تھا کہ اگر کسی کی مدد ان کے گھر میں پڑی کسی چیز سے ہو سکتی ہے تو وہ شوق سے اٹھا لے جائے۔ آخر کو انسان اور دُنیا فانی ہے اور ان کے کون سے وارث بیٹھے تھے۔ ان کی دولت، جائیداد سنبھالنے لیکن یہ

حقیقت تھی کہ کبھی ان کے گھر سے تنکا برابر شے بھی چوری نہ ہوئی تھی۔

ان کی لامحدود آمدنی شہر بھر کے مساکین و غربا کو تحفے تحائف دینے اور ان کے مسائل حل کرنے میں خرچ ہوا کرتی تھی۔

وہ آنٹی لیلیٰ کے سب سے پہلے دوست تھے۔ جونہی انہیں اپنے شہر میں ایک نوجوان ایشین ڈاکٹر کی آمد کا پتا چلا تھا۔ وہ ان کا تعارف حاصل کرنے آموجود ہوئے تھے۔

شروع شروع میں آنٹی اس لمبے تڑنگے، دُبلے پتلے بے ہنگم اجنبی سے خوفزدہ اور خائف رہی تھیں اور خصوصیت سے اس وجہ سے بھی کہ انگریز قوم فطرتاً بے حد سرد مزاج ہے۔

لیکن جلد ہی انہیں انکل ٹموتھی کی رام کہانی معلوم ہو گئی اور ڈرتے ڈرتے ہی انہوں نے ان پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ انکل ٹم نے ان کے اعتماد کو کبھی نہیں توڑا۔ انہوں نے آنٹی کو شہر کا کونہ کونہ دکھایا تھا مقامی لوگوں سے ملوا کے باشندہ بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ آنٹی کو مناسب رہائش گاہ ڈھونڈنے میں مدد دی تھی۔ غرضیکہ ایک تنہا اور غریب الوطن لڑکی کے لیے وہ رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔ وہی تو مرتی ہوئی آنٹی روزا کو آنٹی لیلیٰ کے پاس لے کر آئے تھے۔

خود انکل ٹم کہا کرتے تھے کہ لیلیٰ ان کی زندگی بھر کی بہترین دوست ہے۔

اور لیلیٰ صرف دوست ہی نہ تھی۔ چھوٹی بہن بھی تھی۔ اور فرمانبردار بیٹی کا روپ بھی۔

وہ رشتے جو انکل ٹم نے دیکھے ہی نہ تھے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر میرے علاوہ آنٹی اور بابا کے راز سے کوئی واقف تھا تو وہ انکل ٹموتھی تھے انہیں میں نے اگر کبھی اداس دیکھا تو آنٹی لیلیٰ کے لیے اگر کسی کو ڈانٹتے دیکھا تو صرف آنٹی لیلیٰ کو۔

اور وہ بھی صرف آنٹی لیلیٰ تھیں جن سے انکل ٹموتھی جھگڑا کرتے تھے اور پھر منہ پھلائے اپنی مفلوک الحال سکوڈا لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔

آنٹی لیلیٰ بھی ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ ان کے لیے انکل ٹم اس بڑے بھائی کا روپ تھے جو کبھی اس دُنیا میں نہیں آسکا۔ اور جس کی ان کو ہمیشہ سے تمنا رہی تھی۔ ہر چھٹیوں میں میری آمد ان سب پیارے لوگوں کے لیے جشن کا موقع پیدا کر دیا کرتی تھی۔

اکٹھے ہی باقی سب کو بھی اپنی چھٹیاں لینے کا خیال آجاتا۔ پھر لمبی سیروں، ہائی کنگ کے، پکنکوں کے، تاریخی مقامات کے دوروں کے پروگرام بنتے۔ یہاں تک کہ ہم اکٹھے ہی فرانس اور اٹلی بھی ہو آئے۔

اب خیال آتا ہے کہ میں ان لوگوں کے لیے۔ جو بڑھاپے کی دہلیز پہ پہنچ چکے تھے یا پہنچنے والے تھے اور جن میں سے سوائے آنٹی روزا کے کوئی بھی صاحب اولاد نہ تھا۔ میرا وجود ان کے لیے فیملی بے بی سے کم نہ تھا۔ چنانچہ ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ خوشی اور آرام دیا جائے تاکہ میں بور نہ ہونے پاؤں۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان تین ساڑھے تین سالوں میں مجھے سوائے اپنی دو بہنوں کی شادیوں کے موقع پر جو عین میرے امتحانوں کے دنوں میں ہوئی تھیں۔ کبھی بھی گھر کی یاد نہیں ستائی۔

بابا کی جدائی۔ جو میرے لیے پل صراط عبور کرنے سے کم نہ تھی، اب سہل ہو گئی تھی۔

اور وہ زخم جس کا نام وقار حمید تھا مندمل ہونے لگا تھا۔

ہم سارے مل کر مزے اڑانے کے نت نئے طریقے سوچتے اور آنٹی روزا کا کہنا تھا کہ یہ تمام رونقیں، سارے گہما گہمی، یہ ہلا گلا ان کی خشک اور بے رنگ زندگیوں میں صرف اور صرف میری وجہ سے واپس آیا تھا اور اس کے لیے وہ میرے کس قدر ممنون تھے مجھے اس کا بہت اچھی طرح احساس تھا۔

وہ سچے تھے۔ میں ان کے ساتھ وقت گزار کر ان کی زندگیوں میں دلچسپی لے کر ان کے دُکھ سکھ سنتے ہوئے ان پر گویا احسان عظیم کر رہی تھی۔ کیونکہ میرے ہم عمر نوجوانوں کے لیے، یہاں تک کہ ان کی اپنی اولادوں کے پاس ان کے لیے کوئی وقت نہ تھا۔

انہیں حیرت ہوتی تھی کہ سوائے اس بڈھے گروہ کے میرا کوئی ہم عمر دوست نہ بن سکا۔ نہ میرا کوئی —

بوائے فرینڈ تھا۔ نہ مجھے راتوں کو دیر تک باہر رہنے کا اور ڈیٹنگ کا خبط تھا۔

وہ سارے جب بھی ڈاکٹر شریور کی اسٹیشن ویگن میں بھر کر مجھ سے ملنے لنکنز اِن آتے، مجھے اپنے کمرے ہی میں پاتے۔ میرا سر کتابوں میں ہوتا یا میں کسی نہ کسی لائبریری سے برآمد ہوتی۔ اور ہر وقت پڑھائی میں غرق رہنے کو غیر صحت مندانہ رویہ قرار دے کر مجھے فوراً تفریح کے لیے گھسیٹ لیا جاتا۔ خود میرے کلاس فیلوز حیران تھے کہ مجھے ان بڈھوں کی دوستی میں کیا ملتا ہے۔

پر شاید اس کی وجہ میری تربیت تھی اور وہ احساسِ تحفظ جو ان پیارے لوگوں کی موجودگی میں ملتا تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ فطری معصومیت، سادگی اور اعتماد تھا جو میرے ان دوستوں نے مجھے دیا اور شاید وہ مشرق کا روایتی ہمدردانہ مزاج تھا۔ جو مجھے ان دُکھی اور تنہا لوگوں کے قریب لے گیا۔

لیکن ان کے دیے ہوئے بے شمار تحفے مجھے آج تک ان بے لوث محبتوں کی یاد دلاتے ہیں جو کبھی میری زندگی میں شامل تھیں۔ میری پناہ گاہیں تھیں۔ وہ پُرخلوص دُعائیں جو ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں۔ آج تک میری محافظ ہیں۔ میرے تعاقب میں ہیں اور زندگی کے ہر کٹھن موڑ پر آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیتی ہیں۔ مجھے اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔

وقت کو گزرنا ہوتا ہے اور وہ گزر جاتا ہے۔ غیر محسوس طریقے سے۔

پھر جدائیوں کے موسم آتے ہیں اور پردیسی پنچھیوں کو ایک بار پھر پنکھ پھیلائے اپنے اپنے وطن پرواز کرنا ہوتا ہے۔ ان ڈاروں، ان آشیانوں کی طرف واپس لوٹنا ہوتا ہے جہاں سے یہ سفر شروع ہوا تھا۔

میری پڑھائی بھی مکمل ہو چکی تھی۔

میری گریجویشن پریڈ پہ میرے یہی دوست موجود تھے۔ اور بابا باوجود وعدے کے نہ آسکے تھے، کیونکہ امی ان دنوں شدید بیمار تھیں۔

اور جب میں نے بابا کے نہ آنے کی خبر لیلیٰ آنٹی کو دی تھی، ان کا چہرا کیسا سانولا پڑ گیا تھا۔ ایک لمحے کو ان کی آنکھیں بجھ گئی تھیں۔

ستائیس اٹھائیس سال کی لمبی جُدائی کے بعد شاید ایک موہوم تصوّر دل میں جاگا تھا۔ بابا سے ایک بار پھر ملنے کا تصوّر کتنا خوش آیند، کتنا روح افزا ہوگا اور پھر یہ خوشی بھی قتل ہوگئی تھی کہ کاتبِ تقدیر نے ان کے ہاتھوں پر، ان کے نصیبوں میں قیامت تک کی جدائی کسی انمٹ سیاہی سے لکھ دی تھی۔ اور الوداع کی اس آخری شام کے بعد جب لیلیٰ آنٹی کا جہاز کراچی کی بندرگاہ سے روانہ ہوا تھا وصل کی کوئی گھڑی، دید کا کوئی لمحہ ان کے مقدر میں نہ تھا۔

اب میری روانگی تھی۔ وطن واپسی تھی۔

بے شمار پارٹیاں ہوئیں۔ درجنوں تصویریں اتاری گئیں اور ہر گھر کے کارنس پر میری بھی ایک تصویر سج گئی۔ وہ لڑکی جو پُراسرار مشرق سے آئی تھی اور اس دُور افتادہ شہر کے کچھ مکینوں کے دل میں ایک مستقل گوشہ حاصل کرکے اب واپس جارہی تھی جسے ان سب نے یاد رکھنا تھا کیونکہ وہ سب کی مشترکہ بیٹی رہی تھی۔

اور سبھی چہرے بجھے بجھے تھے۔ سبھی دل بوجھل تھے۔ آنٹی لیلیٰ بات کرتے کرتے چپ ہو جاتیں اور میرا چہرا تکنے لگتیں۔ کبھی میرا چہرا اپنے ہاتھوں میں لے کر چومتیں اور رو پڑتیں۔

مجھے اب اس کرب، اس عذاب کا اندازہ ہوتا ہے جس سے وہ گزر رہی تھیں۔

یہ ان کے لیے ایک بار پھر کمال حسین سے بچھڑنے کے برابر تھا۔ مجھے دیکھ کر انہیں کتنا سکون ملتا ہے اور یہ سب بھی ان سے چھننے والا تھا۔

کیا کیا حیں نہ ہوں گی جو خاموشی سے اس کمزور وجود پر گزر گئی ہوں گی۔

وہ سب مجھے رخصت کرنے ہیتھرو ایرپورٹ تک آئے۔ آنٹی لیلیٰ آنٹی روزا اور انکل تھومس باقاعدہ رو رہے تھے۔ آنٹی ایملی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھیں۔ آنٹی لینا بھی بار بار اپنی آنکھیں پونچھنے لگتیں اور ڈاکٹر شریور سخت ٹینشن میں ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔

"نیرا! مجھ سے وعدہ کرو، میں جب بھی تمہیں بلاؤں

گی تم انگلینڈ ضرور آؤ گی۔" آنٹی لیلیٰ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"آنٹی۔ آنٹی ڈارلنگ آپ آخر میرے ساتھ وطن واپس کیوں نہیں چلتیں؟" میں نے کوئی ہزارویں بار اصرار کیا۔

"جان! میرے لیے واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔" آنٹی لیلیٰ نے پھر وہی بات دہرائی۔ "شاید کسی دن تم اس کی وجہ جان جاؤ۔ جب میں مروں گی ناں تو تمہارے لیے بہت سے راز چھوڑ جاؤں گی اور اگر تم وہ سب جان کر پریشان ہوئیں یا ناراض ہوئیں تو مجھے معاف کر دینا میرا ڈارلنگ! بہت سی چیزوں پہ انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا ناں۔"

آنٹی لیلیٰ کی مدھم آواز آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اُن کا خوبصورت اداس چہرا آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور وہ بات جو میری عقل تب سمجھنے سے قاصر تھی۔ اب کوئی اُلجھن نہیں رہی کیونکہ میرا بیٹا احسن بھی اگلے ہفتے وہ سارے راز لیے انگلینڈ سے وطن واپس آ رہا ہے۔

بہرحال رخصت کا وہ مرحلہ زندگی کے مشکل ترین مرحلوں میں سے ایک تھا۔ اور المیہ یہ کہ میں کوشش کے باوجود پھر کبھی انگلینڈ نہ جا سکی۔

بچھڑنے کا وہ لمحہ ہم دونوں کے لیے بھی دائمی جدائی کی گھڑی تھی۔ میرے بابا اور لیلیٰ آنٹی کے تمام المیے ایک ہی جیسے تھے کہ ہم سب حالات کی مجبوریوں کی زنجیر میں جکڑے بے دست و پا انسان تھے اور بہت سے اختیارات ہماری دسترس میں نہ تھے۔ میں بوجھل دل لیے انگلینڈ سے واپس آ گئی تھی۔ لیکن میری واپسی نے میرے پیارے بابا کے تھکے ہوئے وجود میں نئی روح پھونک دی تھی۔

ہم دونوں نے مل بیٹھ کر ان سارے سالوں کا ایک ایک لمحہ دہرایا۔ میں نے ایک ایک گھڑی کی تصویر انہیں دکھائی۔

اور اب یاد آتا ہے آنٹی لیلیٰ کے ذکر پر ان کی باتیں سُن کر بابا کا چہرہ کیسے روشن ہو جایا کرتا تھا۔ اُن کی آنکھیں کیسے دمکنے لگتی تھیں۔ کچھ دیر کو اس صدیوں پرانی دُکھ کی جھیل میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

"لیلیٰ۔ لیلیٰ بوڑھی ہو گئی ہے۔" بابا میرے البم میں لیلیٰ آنٹی کی تصویریں دیکھ کر کھو گئے تھے۔

"لیکن یہ بھی تو دیکھیں بابا! وقت نے ان کی دلکشی میں کتنا اضافہ کر دیا ہے۔ وہ جوانی میں اتنی خوبصورت نہیں ہوں گی۔" میں نے ان سے کہا۔

"ہاں بیٹا! جو لوگ دل کے خوبصورت ہوتے ہیں ناں۔ حالات ان کے نقش و نگار کبھی مسخ نہیں کر سکتے۔ وہ ہمیشہ خوبصورت ہی رہتے ہیں۔" بابا نے طویل سانس لے کر کہا تھا۔

امی اب مستقل بیمار رہنے لگی تھیں۔ شوگر کا خاندانی مرض اپنے آخری اسٹیج پر پہنچ چکا تھا۔ ساتھ ہی ہائی بلڈ پریشر بھی رہنے لگا تھا۔

انہوں نے میری واپسی سے پہلے ہی میرے لیے دو چار رشتے دیکھ رکھے تھے۔ یوں بھی مجھ سے چھوٹی بہنوں صالحہ اور نفیسہ کی شادیاں میرے پیچھے ہو چکی تھیں۔ اور سب سے چھوٹی حامدہ بھی شیلا چاچی کی بہو بننے والی تھی۔

بابا کی بھی یہی خواہش تھی کہ حامدہ کی رخصتی سے پہلے میری شادی ہو جائے۔

چنانچہ میں نے وقار حمید کا نام اور اس کی یاد ہمیشہ کے لیے دل کے ایک گوشے میں مقفل کر دی۔ اور جیسا کہ میرے پیارے چاہتے تھے۔ احسان علی خان کے لیے ہاں کر دی۔

ہر کوئی تو لیلیٰ آنٹی جیسی بن سکتا ناں۔ ہر کسی میں وہ جرأت وہ استقامت تو نہیں پیدا ہو سکتی ناں۔ جو لیلیٰ آنٹی کے اندر تھی۔ اور جس نے انہیں ایک آئیڈیل خاتون بنا دیا تھا۔ جن پہ صرف رشک تو کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اُن کی طرح کا بننے کا حوصلہ اور ظرف ہم کہاں سے لاتے؟

احسان علی خان کا انتخاب میرے بابا نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ میری ذات کے ہر دُکھ سے آشنا تھے۔ اس لیے انہوں نے میرے لیے دُنیا کے بہترین ساتھی کا انتخاب کیا۔

بڑی حد تک احسان علی خان میرے بابا کی شخصیت کا پرتو تھے۔ ویسے ہی شفیق، مہربان، دُور اندیش اور

وسیع القلب، ویسے ہی نیک اور شریف۔ میں بے حد خوش قسمت تھی۔ پھر بھی کلیجے میں ایک جادوگرانہ پھانس تھی جو کسی طور نہ نکلتی تھی۔

یہ محبت بعض صورتوں میں شاید ایسا ہی زہریلا ناسور بن جاتی ہے۔ میری شادی کے دعوت نامے انگلینڈ تک گئے۔

جواب میں دعاؤں اور محبتوں سے مہکتے کارڈ اور بے شمار خوبصورت تحائف ملے۔

آنٹی لیلیٰ کا تحفہ بے حد قیمتی تھا۔ ہیروں کا بے حد خوبصورت اور نازک سیٹ، جو ان کے ابا نے ان کے لیے اپنے قیام افریقہ کے دوران بنوایا تھا۔

شیلا چاچی حسب معمول وہ سیٹ دیکھ کر دھواں دھار روئیں۔ "ہائے یہ سیٹ لیلیٰ کو خود پہننا کبھی نصیب نہ ہوا!"

"چاچی! یہ سیٹ آپ رکھ لیں۔ ستارا کے کام آ جائے گا۔" میں نے ان کی جذباتی وابستگی دیکھ کر سیٹ اُن کی طرف بڑھا دیا۔

"پاگل ہوئی ہو نیرا! میں یہ سیٹ لوں گی تم سے!" چاچی ناراض ہو گئیں۔ "پگلی میں تو یہ سوچ کر رو رہی ہوں کہ ابا میاں کو اپنی لاڈلی کے مقدر کا کیا پتا تھا کیسی کیسی دولت نہ کمائی انہوں نے۔ دونوں بہنوں کے لیے ایک سا زیور بنوایا۔ پر لیلیٰ کی خوشی ہم میں سے کسی نے نہ دیکھی۔ سبھی کچھ تو وہ میرے بچوں کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ ایک کے ہاتھ کی یہی ایک دو چار چیزیں تھیں اس کے پاس۔ اُس نے یہ جو تمہیں بھیجا ہے۔ تو تم اسے ان ہیروں کی طرح ہی عزیز ہو نا۔" بابا خاموش بیٹھے سنتے رہے۔

امی نے بے زار ہو کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

بہرحال میری شادی ہو گئی۔ اور شادی کے دو ماہ بعد امی کا انتقال ہو گیا۔ حامدہ کی رخصتی کیے بغیر۔ ہم ماں بیٹیاں ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی رہیں۔ دُکھ سکھ کا کوئی لمحہ ہم نے باہم نہ گزارا تھا۔ اعتماد کا کوئی لمحہ ہمارے درمیان سانجھا نہ تھا۔

امی نے کبھی اپنی کہی نہ ہماری سُنی۔ بس ہمیشہ لیا دیا سا رویہ رکھا۔

امی حقیقتاً اپنے ہی گھر میں مہمانوں کی طرح رہیں۔ بابا حقیقتاً امی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ اللہ سے بے حد ڈرنے والے آدمی تھے لیکن امی کو کبھی بھی ابا سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہم چاروں بہنیں خودرو پودوں کی طرح پلیں۔ اور جو باپ کی محبت کی گرمی بھی نہ ملی ہوتی تو جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔

بابا نے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر ماں کی جگہ ہماری نگہداشت کی تھی۔ قدرتی امر تھا کہ چاروں بیٹیاں باپ کے بے حد قریب تھیں اور ماں سے دُور اور خوفزدہ رہتی تھیں۔

بابا نے تو شادیوں کے بعد بھی ہمارا اور ہمارے بچوں کا اتنا خیال رکھا کہ کوئی اچھی ماں بھی ہوتی تو کیا کرتی۔ اور ہم بھی سارے دُکھ سکھ، سارے مشورے لینے کے لیے بابا ہی کا رُخ کیا کرتیں۔ امی نے اس بات کو بھی کبھی معاف نہیں کیا۔ حالانکہ اس میں نہ بابا کا قصور تھا نہ ہمارا۔

یوں امی ایک ناکام زندگی گزار کر اس دُنیا سے رخصت ہو گئیں۔

بابا کے لیے وہ کبھی پناہ گاہ یا سہارا ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ پھر بھی ان کے جانے سے بابا بالکل تنہا ہو گئے۔ چھ ماہ ٹھہر کر انہوں نے حامدہ کی بھی رخصتی کر دی۔ اور اب اتنے بڑے گھر میں کوئی اتنا بھی نہ رہا تھا کہ اُن سے دو باتیں ہی کر لیتا۔

صالحہ اسلام آباد میں تھی۔ نفیسہ جاپان ہوتی تھی اور حامدہ کا میاں ایئر فورس میں تھا۔ یوں اس کا مستقل ٹھکانا کہیں بھی نہیں تھا۔

سوائے میرے بابا کی خبر لینے والا کوئی نہ تھا۔

شیلا چاچی کے اصرار اور ناراضگی کے باوجود بابا اپنے بھائی کے گھر منتقل نہ ہوئے۔ تو بیٹیوں کے ہاں جا کر رہنے کا کیا سوال تھا۔

وہ گھر کیسے چھوڑ دیتے۔ جس سے اچھی بری ہزاروں یادیں وابستہ تھیں۔ اور اکا دُکا دوست اب بھی آ نکلتے تھے۔ پھر بابا کو ایک پرائیویٹ فرم کی طرف سے ٹیکنیکل ایڈوائزر کی آفر آئی۔ تو انہوں نے فوراً قبول کر لی۔ اور یوں ایک بار پھر مصروف ہو گئے۔

میں نے بھی احسان کی اجازت سے پریکٹس شروع کر دی تھی۔ لیکن شاموں کو باقاعدگی سے بابا کے پاس جایا کرتی تھی۔ اور ہم دونوں باپ بیٹی مل کر ماضی کا ایک ایک لمحہ یاد کرتے۔ کبھی ہنستے کبھی روتے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ جب چاروں بچے ان کی محفوظ پناہ میں تھے۔ اور امی کا ناراض وجود بھی گھر میں غنیمت تھا۔

کیسی عجیب بات ہے۔ جب لوگ زندہ ہوتے ہیں تو ہمیں ان کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ جب وہ گزر جاتے ہیں تو ہم ان کی ساری خطائیں معاف کر کے ان کی یادوں کی بھی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ مجھے کتنا افسوس اور ملال تھا۔ کاش کبھی میں نے ہی امی کا اعتماد جیتنے کی کوشش کی ہوتی۔ وہ بھی انسان تھیں۔ جانے کتنے گلے کتنے شکوے لے کر اس دنیا سے گئی ہوں گی۔

باری باری ارم، احسن اور ایمن اس دنیا میں چلے آئے۔ میری ان گنت ذمے داریوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بابا کا جی اور بھی بہل گیا۔

آنٹی لیلیٰ سے خط و کتابت اب بھی برقرار تھی۔ بابا کتنے شوق سے اب بھی ان کے بارے میں پوچھا کرتے۔ میرے نام آنے والے اُن کے خط پڑھا کرتے۔

مسز گورڈن کا میری واپسی کے دو سال بعد انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے جنازے پر ان کے دو ستوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ بچوں کو تو ماں کے مرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ مختلف انداز کی بدقسمتیاں ساری دنیا کی عورتوں کے تعاقب میں ہوتی ہیں اور موقع ملتے ہی انہیں گھیر لیتی ہیں۔

مجھے معلوم ہے۔ آنٹی روزا نے مرتے مرتے بھی جینا کو پکارا ہوگا۔ ڈیلس کو آواز دی ہوگی۔ گیری کو بلایا ہوگا۔ لیکن یہ ساری حسرتیں صدا بصحرا ہی ثابت ہوئی ہوں گی۔ اور موت کے مہربان فرشتے نے انہیں پروں میں سمیٹ لیا ہوگا۔

انکل ٹموتھی بھی بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ انہیں برونکائٹس اور استھما کی بڑی پرانی بیماری تھی۔ جس نے انہیں اور بھی کمزور کر دیا تھا۔

لیکن جی چاہتا تھا ایک دفعہ پھر اپنے پیاروں سے مل آؤں۔ آنٹی لیلیٰ نے دو دفعہ ریٹرن ٹکٹ بھیج کر مجھے شرمندہ کیا اور میرے چاروں طرف مجبوریوں اور ذمے داریوں کا وہ حصار تھا کہ چاہنے کے باوجود میں ایک قدم نہ اٹھا سکی۔ اپنے طور پر ایک مرتبہ چند دنوں کے لیے انگلینڈ کا پروگرام بنایا۔ تحفے ان دنوں آئی ہوئی تھی۔ اور اس نے ایک ماہ بابا کے پاس بھی گزارنا تھا۔

لیکن عین روانگی کے وقت لاہور سے میرے سسر کی وفات کی اطلاع آ گئی چنانچہ سب کچھ ذہن سے نکل گیا۔

دوسری مرتبہ تیاری کی۔ حامدہ کا میاں ڈیپوٹیشن پر لیبیا جا چکا تھا۔ حامدہ کے جانے میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ اور شیلا چاچی نے اُسے بابا کے ہاں بھجوا دیا تھا۔ لیکن ایک دفعہ پھر روانگی سے تین دن پہلے بابا کو بلڈ پریشر کا ایسا دورہ پڑا کہ انہیں ہاسپٹل میں داخل کرنا پڑا۔ خدا نے انہیں ہماری رات دن کی دعاؤں آہ وزاریوں کے طفیل "برین ہیمرج" سے تو بچا لیا لیکن پھر میرا انگلینڈ جانے کو دل نہ چاہا۔ انکل ٹموتھی سے بھی میری خط و کتابت تھی۔ میں نے انہیں صحت مندی کی دعاؤں کے ساتھ کارڈ بھیجا۔ اور جواب میں ڈاکٹر شریلور کی طرف سے ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔

میں نے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی مجبوریوں کے لامتناہی دائرے دیکھے۔ اور دل مسوس کر رہ گئی۔

بہت دنوں بعد آنٹی لیلیٰ کا خط آیا۔ انکل ٹموتھی کی موت ان کے لیے زندگی کا ایک اور بڑا صدمہ تھی۔ ان کا بنایا ہوا۔ دو ستوں پہ مشتمل یہ خاندان آہستہ آہستہ بکھر رہا تھا۔ موت کے قدموں کی چاپ اور واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اور میں ان سے دور تھی۔ سوائے خطوں کے کبھی کبھار ٹیلی فون کر کے انہیں تسلی دینے کے سوا چارہ کیا تھا۔

آنٹی روزا اور انکل ٹموتھی کی موت نے اُن سب پہ صحیح معنوں میں بڑھاپا طاری کر دیا تھا۔ زندگی میں خزاں کے پھیکے بھورے، پیلے رنگ رہ گئے تھے جبھی تو دشمن نے موقع پاتے ہی آنٹی لیزا پہ بھی حملہ کر دیا۔ میں یہ خبر پڑھ کر دہل گئی۔ کینسر تو اتحادیوں سے بھی زیادہ خوفناک اور بے رحم دشمن تھا۔ اور اس نے تاکا بھی کس کو۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کی بے جگری سے خدمت کرنے والی مسیحا کو۔

میرا کسی کام میں جی نہ لگتا۔ آنٹی لیزا کا شگفتہ چہرا میری نظروں میں گھومتا رہتا۔ ان کے جانے کا مطلب تھا۔ آنٹی لیلیٰ اپنے دست و بازو سے محروم ہو جائیں۔ ان دونوں کی ریسرچ کے موضوعات ایک تھے۔ ان کے کام کرنے کا انداز ایک تھا۔ اور دونوں نے مل کر اپنی تحقیق پہ بے شمار عالمی انعام اور اعزاز حاصل کیے تھے۔ کوئی تیسرا ان جیسی تن دہی سے کام کر ہی نہ سکتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو "پروفیشنل نصف بہتر" ہی کہتی تھیں۔

آنٹی لیزا نے میرے خط کے جواب میں مجھے بے حد تسلی دی۔

"نیرا پیاری تم بھول گئیں۔ میں جرمن ہوں۔ میں بھلا اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالوں گی۔ ہر محاذ پہ ڈٹ کر لڑنا ہے مجھے۔ اور تم دیکھنا فتح میری ہوگی۔ کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی تو ہوا ہے نیرا ڈارلنگ۔ کہ میں اس مرض کے کئی پہلو زیادہ بہتر اور واضح طور پر سمجھنے لگی ہوں۔ اور میرے تجربات سے یقیناً کینسر کے بارے میں کئی غلط نظریات کو رد کرنے میں مدد ملے گی۔"

آنٹی لیزا کا باعمل انداز اور ان کا مثبت رویہ آج بھی ناقابلِ شکست تھا۔ وہ موت کے پنجوں سے نبرد آزما تھیں اور پھر بھی ہر پل، ہر گھڑی کوئی نئی بات دریافت کرنے میں کوئی نیا چراغ جلانے میں مصروف تھیں۔ انہیں اپنے جرمن ہونے پہ اسی طرح ناز تھا۔ جیسے ہٹلر کو اپنے آرین ہونے کا ناز تھا۔

اور انہوں نے یہ خطرناک جنگ جیت کر دکھا دی۔ انہوں نے اپنے مایوس مریضوں کے لیے ایک اور مثال قائم کر دی۔

میں نے انہیں مبارکباد کے کارڈ اور اپنے بچوں کی طرف سے تحفوں کے ساتھ اپنی طرف سے ایک بے حد قیمتی شال تحفے میں بھیجی۔

آنٹی ایملی نے اُسی شال میں آنٹی لیزا کی تصویر اُن کے جشنِ صحت یابی پہ اُتاری۔ جو آج بھی میرے لاؤنج میں سجی ہے۔

زندگی کی دبی دبی چال کے ساتھ میری ارم میٹرک میں پہنچ گئی۔ اور جب شیلا چاچی کی بڑی بہو ناصرہ بھابی اپنے طارق کے لیے میری ارم کا رشتہ مانگنے آئیں تب مجھے احساس ہوا کہ میرے سر میں بھی برف بکھرنے لگی ہے۔

احسان کی مخالفت کے باوجود میں نے اُن سے ہاں کروا کے دم لیا۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ کل کو ارم بھی جب عملی زندگی کی دھوپ دیکھے تو محبتوں کا کوئی گھاؤ، منافقتوں کے تیر اس کی روح کو بھی زخمی کر ڈالیں۔ ایسی کوئی گزند پہنچنے سے پہلے میں نے اُسے محفوظ ہاتھوں میں دینے کا فیصلہ کر لیا۔

طارق میرا بھتیجا بھی تھا۔ لائق اور خوبرو تھا۔ فوج میں میجر تھا اور مجھے کیا چاہیے تھا۔

احسان کی مخالفت کی وجہ صرف اتنی تھی کہ ارم ابھی پندرہ سال کی بھی پوری نہ ہوئی تھی۔

صائمہ، نفیسہ اور حامدہ نے بھی سنا۔ تو مجھے خوب لعن طعن کی "اتنی سی بچی تیرے اوپر بوجھ بن گئی ہے ابھی اُس معصوم کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ تو کیوں اُسے ان آزمائشوں میں دھکیل رہی ہے۔"

صرف آنٹی لیلیٰ نے میرے فیصلے کی بھرپور حمایت کی۔ محبت گزیدہ زخم گزیدگان جانتے ہیں کہ محبت سے بڑی دنیا میں کوئی آزمائش نہیں۔ جس کا بوجھ اٹھاتے روح تھک کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

ہم جانتے تھے۔ کس راستے پر عافیت تھی۔ کس راہ پر تحفظ تھا۔ جو بروقت ہمارا نصیب نہ بن سکا تھا۔ بابا جو اس معاملے کے اب تک خاموش مخالف تھے وہ بھی آنٹی لیلیٰ کا استدلال سن کر چپکے سے قائل ہو گئے۔

یوں میری ارم میٹرک کا امتحان دیتے ہی بیاہی گئی۔ طارق ان دنوں کھاریاں میں تھا۔ ارم بھی ایک ماہ بعد سامان لیے کھاریاں چلی گئی۔

ارم کا میٹرک کا نتیجہ شاندار تھا۔ چنانچہ طارق نے اور اصغر بھائی اور ناصرہ بھابی نے بڑی خوشی سے اُسے آگے پڑھنے کی اجازت دے دی۔ میری بیٹی نے دوسری ذمے داریاں سنبھالنی مجھ سے سیکھی تھیں۔ میرے گھر کا زیادہ تر کام وہی دیکھا کرتی تھی۔ اس لیے اپنا گھر خوش اسلوبی سے چلانے میں اُسے کوئی تکلیف نہ ہوئی۔

ادھر ارم نے ایف اے کا امتحان دیا۔ اُدھر طارق کا انگلینڈ کے لیے دو سالہ کورس آگیا۔ یوں میں تو پلٹ کر انگلینڈ نہ جا سکی تھی۔ میری بیٹی اپنی منہ بولی نانی کے پاس ضرور پہنچ گئی۔

میرا پہلا نواسہ انگلینڈ میں آنٹی لیلیٰ اور آنٹی لیزا کے ہاتھوں ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اور آنٹی لیلیٰ نے میرے بابا کے نام پہ اس کا نام کمال رکھا۔

وقت نے ہم سب کو نسل در نسل ایک نہ ٹوٹنے والے رشتے میں پرو دیا تھا۔ ارم اور طارق آنٹی لیلیٰ کے قریب تھے۔ اور ان سے اتنے ہی گہرے رشتے میں منسلک، طارق تو یوں بھی اُن کے سگے بھانجے کا بیٹا تھا۔

طارق کی واپسی تک احسن کا ایڈمیشن کیمبرج یونیورسٹی کے ایک کالج میں ہو گیا تھا۔

اپنے اکلوتے بیٹے کو سمندر پار بھیجتے ہوئے میری بُری حالت تھی۔ لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ مجھ سے بھی زیادہ محبت اور توجہ اُسے لیلیٰ آنٹی سے ملے گی۔

آنٹی لیلیٰ اور آنٹی ایملی اب ریٹائر ہو چکی تھیں اور مل کر لندن کے مضافات میں مقیم تھیں۔ آنٹی لیزا کے ریٹائر ہونے میں البتہ کچھ مہینے باقی تھے۔

ڈاکٹر شر لوسان سے بہت پہلے ریٹائر ہو کر لندن منتقل ہو چکے تھے۔ برسوں کا ساتھ اب بھی نہ ٹوٹا تھا۔ ارم واپس آئی تو اسی طرح قصے کہانیاں سناتی جیسے کبھی میں بابا کو سنایا کرتی تھی۔ میرے بچے جنہوں نے کبھی نہ نانی دیکھی تھی نہ دادی، ان تینوں خواتین سے اور پھر آنٹی لیلیٰ سے مجھ سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے۔

احسن کو گئے ہوئے دو سال سے زیادہ ہو گئے تھے ایمن نے میٹرک کا امتحان دیا۔ تو ایک بار پھر میں نے اور احسان نے انگلینڈ کا ارادہ کیا۔

ایک بار پھر میرے ٹکٹ آئے۔ اور پھر واپس ہوئے بابا پھر شدید بیمار ہو گئے تھے۔

میں ان دنوں اتنی پریشان تھی کہ آنٹی لیلیٰ کے دو خطوں کے جواب بھی نہ دے سکی۔

احسان سے اُن کی بات ہوئی۔ تو انہیں بابا کی بیماری کا پتا چلا۔

اور کیا یہ بھی مقدر کا انوکھا کھیل نہ تھا کہ ایک زمانے کے بن باس کے بعد جب آنٹی لیلیٰ اپنے وطن لوٹنے کا ارادہ کیا تو بابا یہ خوشی نہ سہار سکے۔

ہاسپٹل کے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں میرا ہاتھ تھامے ہوئے۔ میرے بابا نے آنکھیں بند کر لیں۔ جس طرح سے اپنی زندگی انہوں نے خاموشی سے وقار سے گزاری تھی۔ اسی طرح چپکے سے دُنیا سے بھی چلے گئے۔

میں حیران ہوں۔ ان کی نبضیں خاموش پا کر میرے اپنے دل کی دھڑکن بند کیوں نہ ہو گئی۔ ان کی آنکھیں بند دیکھ کر میری آنکھیں اندھی کیوں نہ ہوئیں۔ میں زندہ کیسے رہ گئی آخر ان کے بعد۔ میری روتی چلاتی بہنیں ایک ایک کر کے اکٹھی ہونے لگیں۔ نفیسہ بابا کی بیماری کا سن کر ہی جاپان سے آ گئی تھی۔ حامدہ کا شوہر ان دنوں کراچی بیس پہ ہی تھا۔ اور صالحہ بھی بابا کو دیکھنے آئی ہوئی تھی۔

میرے بابا، شیلا چاچی کی ضعیفی اور ان کے ٹوٹے ٹوٹے بین چپ چاپ کفن اوڑھے لیٹے سُن رہے تھے۔ نہ مجھے کسی نے بتایا نہ شیلا چاچی کو مرتے دم تک بتایا گیا کہ جس شام اُن کے دیور کا جنازہ اُٹھایا جا رہا تھا۔ اُسی شام ان کی لاڈلی بہن بھی دُنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

اُس شام آنٹی لیلیٰ نے تین بجے کے قریب میرے گھر فون کیا تھا۔ وہ بابا کا پتا کرنا چاہ رہی تھیں۔ اور شاید یہ بھی کہ ہفتے کی شام وہ وطن پہنچ رہی تھیں۔

میرے گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ اور نوکر نے بلا تامل انہیں بتا دیا تھا۔ کہ کمال حسین صبح گیارہ بجے فوت ہو گئے۔ اور سب لوگ اُن کے ہاں گئے ہیں۔

آنٹی لیزا نے بعد میں مجھے فون پہ بتایا کہ یہ خبر سنتے ہی انہوں نے دل تھام لیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ انہیں اسپتال پہنچایا جاتا۔ انہوں نے آنٹی لیزا کی گود میں سر رکھ کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ جس شام میرے بابا دفنائے جا رہے تھے۔ آنٹی لیلیٰ کا دل بھی اپنے تمام حوصلے ہار گیا۔

کئی دنوں بعد بابا کے لیکس کے کوئی کاغذات آئے۔

تو صالحہ نے آہستہ سے مجھے یاد دلایا۔ بابا کی وصیت تھی کہ ان کے بعد ان کے کاغذات ان کی اپنی وکیل بیٹی ہی سنبھالے۔

مجھے بھی یاد آیا۔ ہاسپٹل میں ایک شام، جب بابا کی طبیعت ذرا اچھی ہوئی تھی۔ انہوں نے بطورِ خاص مجھ سے کہا تھا۔

”میرے مرنے کے بعد میرے سارے کاغذ تمہیں ہی دیکھنے اور سنبھالنے ہیں نیرا! دیکھو تم پہ شاید کچھ حیران کن انکشافات بھی ہوں گے۔ میرے سیف کے نچلے خانے میں میرا ماضی بند ہے بیٹا۔ اور وہ خط وہ ڈائریاں کسی اور کے ہاتھ نہیں لگنی چاہئیں۔ تمہارا دل کسی بات سے دُکھے تو مجھے معاف کر دینا بیٹا۔ اپنے بابا کو قصوروار نہ سمجھنا۔ میرا جس کسی سے بھی کوئی رشتہ رہا۔ میں نے اُسے پورے خلوص سے نبھایا۔ ہر انداز سے وفادار رہا۔ کسی سے غداری نہیں کی۔ لیکن بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں چندا! جن پہ انسان کو قطعاً کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور جنہیں وہ کبھی بھی نہیں بھولتا۔“

بولتے بولتے آنکھوں کی اُس جھیل میں ایک بار پھر طوفان سے اُٹھنے لگے تھے۔ لیکن بابا نے خود پہ قابو پا لیا تھا۔ اور اس بلاخیز کوشش میں ان کی حالت پھر بگڑ گئی۔ میں کچھ سوچ ہی نہ سکی۔ کہ بابا کس قسم کے معاملات کی باتیں کر رہے تھے۔

ہاسپٹل جانے سے پہلے ہی انہوں نے ساری چابیاں مجھے سونپ دی تھیں۔ لیکن قبل از مرگ ایک وہ بات شاید وہ اپنی زبان سے بھی کہنا چاہتے تھے۔ اور آج صبح جب میں نے بابا کا آفس، اُن کا سیف کھولا۔ تو سب سے پہلے مجھے وہی نچلا خانہ یاد آیا۔ جس کا ذکر انہوں نے کیا تھا۔ اور اس خانے میں بابا کا دل، لیلیٰ آنٹی کی دھڑکنیں، اُن کے مشترکہ جذبے اور دکھ بند تھے۔

ہر خط، ہر ڈائری ترتیب وار اور بے حد احتیاط سے بڑی حفاظت سے رکھی تھی۔

ان نصف صدی میں لکھے جانے والے خطوط میں انسان کے سب سے قدیم اور سب سے صادق جذبے کی تصدیقات تھیں۔

ان میں میرا اور میرے بچوں کا ذکر تھا۔ جو ان دونوں

کو بے حد پیارے تھے۔ شاید ان دونوں نے ایسی ہی اولاد، ایسا ہی بڑھاپا اکٹھے چاہا تھا۔

ان میں امی کا ذکر بھی تھا۔ لیکن بے حد احترام اور خلوص کے ساتھ۔ وہ دونوں امی کو قصور وار یا سزاوار نہ سمجھتے تھے۔ یہ تو قسمت کے کھیل تھے۔ ان خطوں میں ایک دوسرے کے لیے امیدیں تھیں، آرزوئیں تھیں۔ وفا کی امنٹ خوشبو تھی۔ محبتوں کی ناقابلِ شکست مہک تھی۔

یہ وہ خط تھے جنہوں نے ایک ہی ڈار اور ایک ہی منزل کی دو بچھڑی ہوئی کونجوں کو سالہا سال حوصلے دیے تھے۔

زندگی کے ہر محاذ پہ اُن کا سر بلند رکھا تھا۔ زندگی کے ہر میدان میں انہیں سرخرو دیکھا تھا۔ جو ایک دوسرے سے اوجھل رہ کر بھی، ایک دوسرے کی پشت پر موجود رہے تھے۔

جو ہار کر بھی، جیتنے والوں میں سے رہے۔

اور جنہیں بچھڑ کر بھی وہ سب کچھ مل گیا تھا۔ محبت اور سکون جو ہماری بد قسمت امی کے نصیب میں نہ تھا۔

میں نے سارے خط، ساری ڈائریاں پھر ایک بار بند کر دیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کا کیا کروں۔

مجھے ڈر تھا۔ میری بہنیں کہیں یہ سب نہ دیکھ لیں۔ انہیں شاید یہ بات کبھی سمجھ میں نہ آتی کہ محبت کرنا کوئی قابلِ تعزیر اور ناقابلِ معافی جرم نہ تھا۔ یہ انسان کا بنیادی حق اور انسان کے ٹوٹے ہوئے خواب تھے۔

میں نہیں چاہتی تھی کوئی کسی بھی انداز میں میرے بابا یا لیلیٰ آنٹی کے بارے میں غلط رائے قائم کرے۔

لیکن کچھ ماورائی، آسمانی طاقتیں تھیں۔ جنہوں نے زندگی میں بھی ان کی عزت کی حفاظت کی تھی۔ اور آج بھی ان کے وقار کی ضامن، ان کے نام کے تحفظ پہ کمربستہ تھیں۔

سہ پہر کو آنٹی لیزا کا فون آگیا۔

"نیرا پیاری۔ احسن چھٹیاں گزارنے پاکستان آرہا ہے۔ اس کے ہاتھ ایک بند پارسل بھیج رہی ہوں۔ یہ لیلیٰ کی امانت ہے۔ اور کئی سال پہلے اس نے مجھے اور ایملیا کو وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد یہ چیزیں کمال حسین کو یا پھر تمہیں بھجوا دیں۔"

مجھے معلوم ہے۔ ان خطوں میں کیا ہوگا۔ اُن ڈائریوں میں کیا ہوگا۔ بابا کا دھڑکتا بے چار ادل، بابا کے رنج و الم جو آنٹی لیلیٰ کے سینے میں دفن ہوتے رہے۔ اور ان سالوں کی کٹھن مسافت کی روداد ہوگی جو آنٹی لیلیٰ نے بغیر کسی سائے، بغیر کسی ہمسفر کے طے کی۔

ان دونوں کو اچھی طرح معلوم تھا یا شاید یہ بھی کوئی خاموش معاہدہ تھا۔ جو انہوں نے باہمی رضامندی سے کیا تھا۔ کہ میں ہی ان کے دکھوں کی، ان کے رازوں کی اصل وارث ہوں۔

اور ساری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد۔ اس آخری پہر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ بابا کے جہلم کے بعد ان کی پائنتی پر ایک اور چھوٹی سی قبر بنے گی جس میں یہ خط، یہ ڈائریاں دفن ہوں گی۔ کوئی پوچھے گا تو۔ اُسے یہ پتا چلے گا۔ کہ یہ ایک معصوم مسافر بچے کی آخری آرام گاہ ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کئی صدیوں بعد۔ جب ماہرینِ آثارِ قدیمہ یا نئی بستیاں آباد کرنے والے یہ قبرستان کھودیں۔ تو گلاب اور نرگس کے پودوں کی جڑوں میں انہیں یہ مقدس، مہکتے راز ملیں اور انہیں پتا چلے کہ دنیا میں صرف شیریں فرہاد اور رومیو جولیٹ ہی نہ گزرے تھے۔ کبھی اس کائنات میں لیلیٰ اور کمال حسین دو خوبصورت روحیں بھی رہتی تھیں۔ جن کے قصے گمنام رہے۔ لیکن جن کی وفا سرخرو اور ناقابلِ تسخیر رہی۔